محمد حنیف ندوی

فیلاسافیکل کانگرس پشاور میں پڑھا گیا

اسلام میں نبوّت کا تصوّر

انسان نے علم و معرفت کے دروازوں پر پہلے پہل کب دستک دی، اور کب اس نے زندگی کی مادی ضروریات سے یکسو ہو کر اپنے گردوپیش پر غور و فکر کی عادت ڈالی۔ اس کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرنا دشوار ہے۔ تاہم اتنی بات قطعی و درست ہے کہ حیاتِ انسانی کے بارہ میں پہلا اور منضبط تصور اس کو انبیاء ہی کے طفیل حاصل ہوا۔ یہی وہ پاکباز گروہ ہے جس نے اوّل اوّل علم کا پرچم لہرایا، جس نے سب سے پہلے انسانی معاشرہ کو عقائد و ایمانیات سے روشناس کرایا۔ اعمال و کردار کی سمتیں متعین کیں۔ اور بتایا کہ زندگی کچھ اقدار اور نصب العین رکھتی ہے۔ اور کچھ ضوابط اور پابندیاں چاہتی ہے۔ گویا نبوت علم اور افکار کی طرف پہلا قدم ہے اور اوّلین سرچشمہ ہے انسانی معلومات کا۔ یہاں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ نبوّت سے ہماری مراد وہ نبوّت نہیں جس کا تصور بائیبل نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ وہ اس درجہ سمٹا ہوا اور محدود ہے کہ اس کو انسان کی رشد و ہدایت کی طویل ترین تاریخ پر پھیلانا آسان نہیں۔ ہم جب نبوت کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے مقصود وہ رہنمائی ہوتی ہے جس کی شیم انگیزیوں سے انسان ہمیشہ اور ہر جگہ بہرہ مند رہا ہے جو زندگی و فکر کا اس وقت بھی ایک ضروری تقاضا تھی۔ جب ابھی انسانی شعور کے پیچ پوری طرح نہیں کھل پائے تھے اور اس وقت بھی اس کی برکات اور نفع رسانیوں کا سلسلہ قائم تھا۔ جب اس نے تہذیب و تمدن کے اچھے خاصے ایوان تعمیر کر ڈالے تھے۔ ہمارے نزدیک اس کا دامنِ فیض دنیا کی ہر ہر قوم تک وسیع رہا ہے۔ اور ہر ہر انسانی گروہ اور جماعت میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں کہ جنہوں نے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے، ان کے اعمال کو سنوارا ہے، روح کو چمکایا ہے اور اس کے ذہن و فکر کی تسکین کے لئے مسلمات و عقائد کا ایک نقشہ پیش کیا ہے۔ کیا ان کو دنیا کی ہر ہر قوم نے انبیاء و رسل ہی کے اصطلاحی نام سے پکارا ہے؟ یہ ضروری نہیں۔ قرآن ان سب کے لئے ایک ہی جامع لفظ استعمال کرتا ہے۔ ولکلِ قومٍ ھاد۔ کہ دنیا کی تمام قوموں میں ہدایت و رہنمائی کا فرض انجام دینے والے نفوس موجود رہے ہیں۔ اور شرائع و مناسک کے اختلاف کے باوجود ان سب نے مشترکہ اور جانی بوجھی صداقتوں پر اپنی دعوت و اصلاح کی بنیاد رکھی ہے۔

علم و ہدایت کے اس ظہور کے لئے جسے ہم نبوّت سے تعبیر کرتے ہیں کیا کوئی حکیمانہ وجہ جواز پائی جاتی ہے اور ایسی بنیادوں کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جن سے اس کی معقولیت و ضرورت پر روشنی پڑ سکے، یہ سوال بہت اہم ہے۔ جواب یہ ہے کہ یقیناً ایسا ہونا ممکن ہے لیکن اس غرض کے لئے مسئلہ کے ان تین پہلوؤں کا خصوصیت سے لحاظ کرنا ہوگا۔

۱۔ آیا علم اور ازدیادِ علم کا فطری تقاضا تسکین و طمانیت چاہتا ہے یا نہیں۔
۲۔ ربوبیت میں جو اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت ہے ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داریاں بھی داخل ہیں یا نہیں۔
۳۔ انسانی معاشرہ کے ارتقا میں اس سے کیا مدد مل سکتی ہے۔

جہاں تک علم اور اس میں روز افزوں ترقیات کی خواہش و آرزو کا تعلق ہے کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ انسانی فطرت کا لازمی نتیجہ نہیں ہے۔ جستجو اور تجسس اس کی طبیعت کا وہ خاصہ ہے کہ جس سے جیتے جی یہ کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ ہر ہر چیز کو اچھی طرح جاننا چاہتا ہے اور کائنات کے ہر ہر راز کو اپنی گرفت میں لینے کا متمنی ہے۔ اور آج جو دنیا میں ترقیات کی دھوم اور ایجادات کی گہما گہمی ہے۔ یہ نتیجہ ہے اسی تمنا اور آرزوئے ادراک کا۔ قرآن نے ہبوطِ آدم کے جس قصہ کا کئی بار ذکر کیا ہے اس میں قابلِ غور پہلو دراصل یہی ہے کہ انسان نے اس آرزو اور تمنا کو پورا کرنے کے لئے کتنی بڑی قیمت ادا کی۔ یعنی عیش و نشاط دائمی کی فراوانیوں کو چھوڑنا محض اس بنا پر گوارا کیا تاکہ اپنے تجربہ سے یہ جان سکے کہ جس درخت کا پھل کھانے سے اس کو روکا گیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں علم و ادراک سے متعلق یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کے دو متضاد رخ ہیں۔ ایک طرف تو یہ بحرِ بے پایاں ہے اور اس کی بے پناہیوں کی کیفیت یہ ہے کہ ہر ہر منزل کے بعد بھی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی سفر ختم نہیں ہوا۔ اور اس سے آگے بھی کچھ منزلیں ہیں۔ دوسری طرف اس بے پایانی کے باوجود اس کے متعین اور محدود دائرے بھی ہیں۔ اور ان میں کچھ یقینی مقامات اور قطعی مورچے بھی ہیں۔ جہاں فہم و فکر کے رواں دواں قافلے دم لیتے ہیں۔ اور انسان کا تقلبِ ذہن یقین و اذعان کی آسودگیوں سے مالا مال ہوتا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں انسان کی علمی کوششیں ایک مخصوص قالب اختیار کر لیتی ہیں اور ہر ہر علم و فن کے یقینیات متعین ہوتے ہیں ——— پھر جس طرح ہر ہر فن اور علم کی ہر ہر شاخ کے کچھ مسلمات اور یقینیات ہوتے ہیں۔ اسی طرح مذہب اور اخلاق کے بھی یقینیات ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان یقینیات کو اجاگر کریں اور اپنی زندگی کے ہر ہر گوشہ میں ان کو سمو کر دکھائیں۔ وحی اور الہام کی چاہے ہم کوئی بھی تشریح کریں یہ تو بہرحال ماننا پڑے گا۔ کہ یہ علم ہی کی کسی نوعیت یا درجہ کا نام ہے۔ اور حکمت و بصیرت ہی کی کسی صفت یا مقام سے تعبیر ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نبوت کے نقطۂ نظر سے اخلاقیات اور مذہب کا پورا نظام فکر ایسا ہے کہ جس کو نظر و بصر کی وسعتیں کسی نہ کسی حد تک گھیر سکتی ہیں اور جس کا علم و حکمت کی گہرائیاں کسی نہ کسی درجے میں جائزہ لے سکتی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ جس طرح طبیعیات اور سائنس کے تجربات و اکتشافات کا نقطۂ آغاز یہ تصور ہے کہ عالم مادی کی ہیبتناکیوں اور تحیرزائیوں کا پردہ چاک کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مذہب اس مفروضے اور دعوت سے شروع ہوتا ہے کہ خیر و شر کے حدود کو متعین کرنا ممکن ہے۔ اور اس راہ کی مشکلات و مراحل پر قابو پانا محال نہیں۔ بلکہ غزالی تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ خود نبوت کی معجزہ طرازیوں کا تجربہ بھی استطاعتِ انسانی کی حدود سے باہر نہیں۔ اور ایک شخص تزکیہ باطن اور تطہیرِ قلب کی دولت کو پا لینے کے بعد اس قابل ہو سکتا ہے کہ انوارِ نبوت کا براہِ راست سامنا کر سکے۔ اس وضاحت سے

ثابت ہوا کہ خیر و شر کے بارہ میں اشاعرہ کا مسلک بداہتاً غلط ہے۔ اور یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ نیکی اور بدی میں امتیاز معقول نہیں ہے۔ اور خیر و شر اور اطاعت و معصیت کی تفریق محض دینی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں نبوت کے لئے کوئی سمجھ میں آنے والی اساس باقی نہیں رہتی۔ مزید برآں خیر و شر میں جو یہ امتیاز و تفریق پائی جاتی ہے۔ خود اس کی اخلاقی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ اور ہم اس لائق نہیں رہتے کہ دنیا کے سامنے مذہب کو خیر و خوبی کے ایک مکمل نظام کی شکل میں پیش کریں۔ اور یہ جتا سکیں کہ تہذیب و تمدن کے انحرافات نے کن نئی نئی گمراہیوں اور ضلالتوں کو ختم دیا ہے۔ اور ان کا کیا مداوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ نے اپنے مسالک کی بنیاد معتزلہ کی ضد پر رکھی ہے۔ اور اس کے دوررس نتائج اور خطرناک لوازم پر غور نہیں کیا۔ ورنہ وہ اتنے اہم مسئلے کے متعلق اس درجہ غیر معقول بات نہ کہتے بہرحال ہمیں کہنا یہ ہے کہ نبوت کی علمی توجیہ یہ ہے کہ اس سے ایک طرف تو ہمیں اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ عقائد و سیرت کے محدود خانوں میں مسلمات کیا ہیں اور وہ کیا یقینی و قطعی پیمانے ہیں جن پر ہمیں فرد اور معاشرہ کی سیرت کو ڈھالنا چاہیئے۔ اور دوسری طرف اس سے علم کے اس باطنی رخ کی تسکین کا سامان بہم پہنچتا ہے جو غیر محدود وسعتوں اور پھیلاؤ کا متقاضی ہے۔ جہاں کے معارف بوقلموں تجلیات رنگارنگ کا یہ عالم ہے کہ مجاہدہ و مراقبہ کی ہزار ہا قیاں بھی اس کا احاطہ کرنے والی نہیں

نبوت کا دوسرا بنیاد اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے۔ یہ تقاضا تقاضائے علم سے زیادہ اہم ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دراصل یہی وہ وجہ ہے جس سے کہ اس نظام رشد و ہدایت کی پوری پوری تشریح ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ بحث خارج از موضوع ہے کہ خدا کے وجود یا ربوبیت کو ثابت کیا جائے۔ کیونکہ جب ہم نبوت پر اظہار خیال کریں گے تو لازماً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے چند ابتدائی مقدمات پہلے سے مان لئے ہیں۔ ہم نے یہ تسلیم کر لیا ہے۔ کہ یہ کارگاہ حیات بخت و اتفاق کی کارفرمائیوں کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ اس کو پیدا کرنے والا کوئی علیم و حکیم ہستی موجود ہے۔ ہم نے یہ باور کر لیا ہے کہ اس ہستی غیر محدود کے ساتھ محدود انسان کے تعلق بھی استوار ہو سکتے ہیں۔ اور ہم ایمان رکھتے ہیں کہ اس مبداء فیض کا تعلق اپنی کائنات کے ساتھ صرف ایک تخلیقی قوت یا محرک تعلق کا سا نہیں۔ بلکہ شفقت و محبت اور ربوبیت و رحمت کا ہے۔ صفت کلام سے بھی وحی و الہام کی تشریح ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے مقصد ہدایت کی ذمہ داریوں پر مکمل روشنی نہیں پڑتی اور نبوت کے مقاصد واضح نہیں ہو پاتے نیز یہ نہیں ثابت ہو پاتا کہ خلق خدا کی رشد و ہدایت کے لئے کس درجہ مفید، ضروری اور بابرکت ہے۔ ربوبیت کیا ہے۔ اور کس طرح یہ ضروریات ہدایت پر مشتمل ہے۔ اس کو سمجھنے سے پہلے اس کی لغوی تشریح ضروری ہے۔ راغب نے اس لفظ کی وضاحت بڑی عمدگی سے کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ وہ صفت کمال ہے جو تخلیق کی ابتدائی سادگی سے لے کر تکمیل و ارتقا کی تمام کڑیوں تک کسی شے کی نگرانی کرتی ہے۔ اور ہر ہر کڑی اور منزل پر یہ جس جس نوع کی سازگاریوں کی حاجت پیش آتی ہے اس کا احسن وجہ پورا کرتی ہے لیکن اس کی جزو تفصیل کے لئے قرآن حکیم کے ان مقامات کا انتخاب کرنا چاہیئے جہاں جہاں یہ لفظ وارد ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا۔ کہ راغب کی تشریح کس درجہ صحیح اور درست ہے۔ اس ضمن میں ہم صرف دو تین کے حوالے پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

کی ربوبیتوں کا اندازہ کرنے کے لئے والدین سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ یہ کس طرح اپنے بچوں کی نفسیات کا خیال رکھتے ہیں کس شفقت و محبت سے ان کی ضروریات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کس طرح عمر کی ہر ہر منزل میں ان کی مناسب حفاظت اور تربیت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ قرآن اس دیکھ بھال، اس نگرانی و رہنمائی۔ اور شفقت و محبت کے طویل اور بلا وقفہ سلسلے کو جو پیدائش سے لے کر بلوغ و شعور تک برابر جاری رہتا ہے۔ ربوبیت سے تعبیر کرتا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربياني صغيرا۔ اس آیت میں اولاد سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ والدین کے حق میں نہایت درجہ سعادت مند رہیں۔ اور دعا کرتے رہیں کہ جس طرح ان کے ماں باپ نے ان کو پال پوس کر پروان چڑھایا ہے۔ اسی طرح اسے پروردگار تیری رحمتیں ان کے شامل حال رہیں۔ دوسرا حوالہ ایسی آیات سے متعلق ہے کہ جن میں وحی اور نبوت کی فیض رسانیوں کو کھلے بندوں ربوبیت ہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے۔ اسی سورت میں ہے ذالک مما اوحی الیک ربک من الحکمة سورہ انعام میں ہے وھذا صراط ربک مستقیما۔ نحل میں ہے ادع الی سبیل ربک شعراء میں حضرت موسیٰ اور ہارون سے کہا ہے۔ آپ فرعون کے پاس جائیے اور کہئے۔ انا رسول رب العالمین۔ لفظ رب کے ان استعمالات سے قرآن کے طرز استدلال میں کوئی گھپلا نہیں رہتا۔ اور بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ صفت ربوبیت سے کیونکر نبوت کی تشریح ہوتی ہے۔ غیر اصطلاحی اور سادہ پیرایہ بیان میں قرآن حکیم یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ایک ذرہ ادنیٰ سے کائنات کو ارتقاء و تقدم کی تمام منزلوں تک پہنچاتی ہے ایک دخان اور بخور ہیولا سے فلکیات کے پیچیدہ نظام نجوم و کواکب کو منصۂ شہود پر لاتی ہے۔ اور زندگی کے حقیر اور سادہ خلیوں سے انسانیت کی ان طرفہ طرازیوں تک نگرانی و محافظ رہتی ہے تو یہ بات عقل و فہم میں آنے والی نہیں کہ انسانی روح اور اخلاق کے ارتقاء کے لئے اس کی فیض رسانیوں میں کوئی جنبش اور حرکت پیدا نہ ہو۔ جب مادیت کی گاڑی زندگی ان گہما گہمیوں تک پہنچتی ہے۔ تو ضروری ہے کہ روح کی بلندی و بالیدگی اور قلب و ضمیر کی معموری و آبادی کے لئے اس کا سلسلہ فیض آگے بڑھے۔ یعنی اگر آسمان آفتاب و ماہتاب کے انوار سے مستنیر ہے اور اس کی پہنائیوں میں ہزاروں اور لاکھوں ستارے رونق افروز ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سطح زمین پر بدستور تاریکیوں کی فرمانروائی رہے۔ اور یہاں کی تاریکیاں اور ظلمتیں اجالوں اور روشنیوں سے نہ بدل پائیں۔ خطابت بر طرف مقصود یہ ہے کہ اگر انسان شروع ہی سے رہنمائی کا محتاج ہے۔ اگر ہدایت و رشد سے اس کے فی الواقع اخلاق سنورتے ہیں۔ اس کی روح مجلا ہوتی ہے۔ اور یہ زیادہ کامیابی سے معاشرہ کی خدمت کر سکتا ہے تو ربوبیت کبریٰ کو قطعی اس کی مدد کرنا چاہیئے۔ اور دستگیری میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے یہی مدد اور اعانت قرآن کی اصطلاح میں نبوت یا رسالت ہے۔

تیسرا پہلو جس سے نبوت کی عقلی توجیہ سمجھ میں آتی ہے۔ انسانی معاشرہ کا ارتقاء ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ سامی قوموں کی حد تک کم از کم انسان کی فکری زندگی کا آغاز مذہب ہی سے ہوا ہے۔ پہلے انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کے سامنے ایک منضبط تصور حیات پیش کیا ہے اور ان کے بعد ان کی تعلیمات کی تشریح و توضیح کے ضمن میں مختلف علوم و فنون معرض وجود میں

آتے ہیں۔ مثلاً یہودیوں کی قانونی و فقہی صلاحیتیں اور تاویل و تعبیر کی کاوشیں تو تورات کے بعد ہی ابھری ہیں۔ عیسائی اقوام کے ذہنی افق کو جو تابناکیاں میسر آئی ہیں۔ ان میں بیشتر ان مساعی کو دخل ہے۔ جو مسلمانوں نے اشاعت علوم کے سلسلہ میں انجام دیں۔ اور خود عربوں نے یونانی ذخائر کو عربی میں اس وقت منتقل کیا جب اس سے بہت پہلے صرف و نحو فقہ و حدیث۔ اور تفسیر و قرآن سے متعلقہ علوم فلسفہ و فکر کے لئے راہیں ہموار کر چکے تھے۔ ورنہ وہی عرب تھے۔ وہی ان کی تگ و تاز کے لئے کشادہ اور وسیع صحرا تھے۔ اور وہی ان کا جذبات آفرین جغرافیہ تھا جس کو رینان محض بر بنائے غلط فہمی نظریۂ توحید کا سبب قرار دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں کہیں ذہن و فکر کی بالیدگی نہیں پائی جاتی ہم نبوت کی اس توجیہ کو زیادہ حاوی اور جامع نہیں سمجھتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں کتنی ہی ایسی قوموں کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ جن میں نبوت کے بغیر بھی ذہن انسانی نے معجزات دکھائے ہیں۔ اور فکر و کاوش کی بلندیوں کے حیرت انگیز ثبوت مہیا کئے ہیں۔ تاہم اتنا کہنا صحیح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور کوششوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی ارتقاء کا راستہ نسبتہً زیادہ آسان اور زیادہ مختصر ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ کے ہر ہر دور میں اور تہذیب و تمدن کے ہر ہر حلقہ میں جو اخلاقی اقدار کا کسی نہ کسی حد تک احساس موجود رہا ہے۔ اور خیر و شر میں تفریق کا خیال قابل لحاظ متصور ہوا ہے۔ اور انسان نے اجتماعی نصب العینوں کو افراد کے اغراض و مقاصد پر مرجح جانا ہے۔ تو یہ نتیجہ ہے مذہب کی ہزاروں برس کی تگ و دو اور سعی و کوشش کا۔ کہ محض اسی کی بدولت انسانی ضمیر میں نیکی نے جگہ پائی ہے۔ اور اسی کے طفیل ذمہ داری اور فرض شناسی کا جذبہ ابھرا ہے۔ ورنہ کون جانتا ہے کہ انسان آج وحشت و بربریت کی کس منزل میں روپوش ہوتا

کیا نبوت کا تصور اسلامی تعلیمات کے مطابق میکانکی ہے اور پیغمبر کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ جو کچھ اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس کو بلاکم وکاست لوگوں تک پہنچا دے۔ اس میں اس کی اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں۔ عملی خوبیوں اور اجتہاد و بصیرت کی برائیوں کا کچھ دخل نہیں ہوتا۔ ایک بہت بڑے مستشرق ای سیل (E. SELL) کا یہی خیال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس رائے میں یہ منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ مغرب کے ان سب حضرات نے جن کو اسلامیات کے گہرے مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ اسلام کے تصور وحی کے بارے میں اسی انداز کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس میں ذرا بھی صحت کا کوئی پہلو پایا جاتا ہے اور کوئی پڑھا لکھا مسلمان بھی ہماری علمی تاریخ میں ایسا گزرا ہے جو یہ مانتا ہو کہ وحی و الہام کے مقابلہ میں پیغمبر کی اپنی شخصیت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یا یہ کہ پیغمبر کے لئے خاص صلاحیتیں اور سطح ذہنی درکار نہیں۔ اور منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے معنی بصیرت و اجتہاد کی ممیزات سے محروم ہونا ہے۔ ہم تینوں پر شبہ نہیں کر سکتے ممکن ہے کہ قرآن کی آیات کے سرسری مطالعہ سے ان لوگوں کو ٹھوکر لگی ہو اور یہ خیال محض سوئے فہم پر مبنی ہو۔ ورنہ بحیثیت مجموعی جہاں تک وحی و نبوت کی متعلقہ تفصیلات پر غور کا تعلق ہے اس سے تو ہرگز یہ ثابت نہیں ہو پاتا۔ کہ نبی یا رسول اطلاقاً ذہنی و [illegible] جہات سے متصف نہیں ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے ان آیات کو دیکھنا مناسب ہوگا۔ جن میں منصب رسالت

کے استحقاق پر بحث کی گئی ہے۔ ان سب آیات میں بالعموم استعمال ہوا ہے۔ وہ اصطفاء، اجتہاد اور اختیار کا ہے۔ جس کے معنی عمدہ ترین انسان کو کسی اچھے مقصد کے پیش نظر چننے اور چھانٹ لینے کے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہے: یموسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالتی و بکلامی۔ آل عمران میں تمام انبیاء کے بارہ میں ہے ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء۔ حضرت موسیٰ کے متعلق وانا اخترتک کی تصریح بھی سورہ طہ میں مذکور ہے۔ ان سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی انبیاء کے تقرر و ماموریت میں ان کی غیر معمولی دماغی و باطنی خوبیوں کا خصوصیت سے خیال رکھتی ہے یہی نہیں بلکہ اس تقرر سے بھی بہت پہلے جن لوگوں کو اس منصب پر فائز کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ان کی شروع سے نگرانی بھی کرتی ہے اور ان کے فکر و کردار کی سمتوں کو ہمیشہ خیر و رشد کی جانب مرکوز بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم سے متعلق فرمایا ولقد اتینا ابراھیم رشدہ من قبل کنا بہ عالمین کہ ہم نے ان کو یونہی نبوت کی سرفرازیاں نہیں بخشیں بلکہ یہ اس کے اہل تھے اور ہم ان کی اس اہلیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ رہا یہ سوال کہ کیا فرازِ نبوت پر متمکن ہونے کے بعد انبیاء اختیارات و اجتہادات کو کام میں لاتے ہیں۔ تو اس کا روشن ثبوت آپ کو آنحضرت کی زندگی میں ملے گا کہ نبوت و رسالت کا اس سے بہتر اور جامع پیکر مثالی ملنا مشکل ہے۔ قرآن حکیم نے شریعت سے متعلق جن تفصیلات کو بیان کیا ہے۔ ان کی حیثیت صرف بنیادی اور ضروری مسائل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کا مکمل سانچہ اور نقشہ قرآن میں مذکور نہیں۔ اس کو آنحضرت نے محض اپنے اجتہاد۔ بصیرت نبوی۔ اور ملکۂ ذوق رسالت سے دریافت فرمایا۔ اور ترتیب دیا ہے۔ لیکن اس اجتہاد و بصیرت کے بارے میں اس نکتہ کا جان لینا بہت ضروری ہے کہ یہ باقاعدہ فقہی و وضعی طریق اجتہاد و تعبیر سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس کے ساتھ اللہ کی نگرانی اور صحت استدلال کی ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ جن سے کہ ایک عام مجتہد اور فقیہ قطعی محروم ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک عام فقیہ اور مجتہد تو صرف ادب و زبان اور قاعدہ و قانون کی روشنی میں اپنے استنباط کو حق بجانب ٹھہراتا ہے اور ایک پیغمبر اللہ کی عطا کردہ روشنی اور ذوق صحیح۔ اور ملکہ کاملہ سے استفادہ کرتا ہے۔ جو نبوت کا لازمی نتیجہ اور منطقی ثمرہ ہے۔ ان دونوں میں بین فرق یہ ہے کہ پیغمبر کی ایک ایک فکری لغزش پر اسے ٹوکا اور متنبہ کیا جاتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ منشاء ایزدی کیا ہے۔ جبکہ مجتہد اور امام قطعی صحت استدلال کا مدعی نہیں۔ ہم ان لوگوں کے فہم و فراست کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے کہ اس انداز استدلال اور طریق استنباط کو وحی خفی سے اول اول تعبیر کیا کہ اس سے زیادہ موزوں تعبیر اس مفہوم کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اجتہادات اس نقطۂ نگاہ سے یقیناً وحی کے دائرہ میں آ جاتے ہیں کہ ان میں وہی صحت۔ وہی استواری۔ اور صیانت کارفرما ہے۔ جو وحی کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔ خفی کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے اس کا مطلب یہ ہے اس اسلوب استدلال میں کہ القاء و الہام کا پہلو استدلال کے پہلو سے نسبتاً زیادہ قوی نہیں۔ یوں سمجھیئے کہ قرآن کو تو ایک طرح سے رشد و ہدایت کے منبع اور جڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس کے اندر بالقوہ ارتقا کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں لیکن اس پر برگ و بار اور شاخ و فروع کا جو

اضافہ ہوا ہے۔ اس کو ذوقِ نبوت اور قلبِ رسالت کی سازگاریوں نے جنم دیا ہے اور وہ ارتقا کی کڑیاں جو قرآن میں پہلے سے موجود تھیں، تفصیلی شکل اور قالب میں آنحضرت کے ارشادات اور سیرت کی بدولت ڈھلی ہیں۔

یہ خیال کہ نبوت کا تصور اسلام میں میکانکی ہے۔ یوں بھی درست نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمان حکمائے بہرحال اس کو فکر و عمل سے آگے کی منزل قرار دیا ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ کہنا کس درجہ مہمل ہے کہ اس سے پیغمبر کی اپنی اجتہادی صلاحیتیں متاثر ہوتی ہیں۔ کیونکہ اگر ایک شخص کا منبعِ علم۔ زیادہ روشن۔ زیادہ اونچا اور زیادہ لطیف ہے اس کے ذہن و فکر کی بالائی سطحیں زیادہ منور۔ زیادہ تابناک اور زیادہ براق ہیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ فکر و اجتہاد کی زیریں تہیں۔ ان انوار و تجلیات سے قطعی کسبِ ضو نہ کر پائیں۔ کیا بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ کیا جس شخص میں حدس (INTUITION) کی غیر معمولی قوتیں پائی جاتی ہیں اس کی عقلی سطح کمزور ہو جاتی ہے۔ یا جس کی عقلیت قوی تر ہو۔ اس کی علم سوجھ بوجھ بے کار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر یہ بات صحیح نہیں تو یہ بات بھی صحیح نہیں کہ وحی و جبریل کی آمد سے پیغمبر کی اپنی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ (باقی)

حکمتِ رومی

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب

قیمت:- تین روپے

اسلام کا نظریۂ تاریخ

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی صاحب

قیمت:- تین روپے

افکارِ ابن خلدون

مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی

قیمت:- تین روپے آٹھ آنے

طب العرب

مترجمہ حکیم سید علی احمد صاحب نیر واسطی

قیمت:- چھ روپے

اسلام اور مسئلۂ زمین

مصنفہ پروفیسر محمود احمد

قیمت تین روپے آٹھ آنے

بیدل

مصنفہ خواجہ عباد اللہ صاحب اختر

قیمت:- چھ روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ - ۲- کلب روڈ - لاہور